Date of Publication: 16-11-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 Nov. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 November 2013 ۲۲ تا ۲۸ نومبر ۲۰۱۳ء

Issue: 44. Vol.: 72 شمارہ نمبر: ۴۴، جلد نمبر: ۷۲

شمیم حنفی

ادبی اور تہذیبی بصیرت کے 75 سال

ڈاکٹر سرور الہدیٰ (شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی-25)
sarwar103@gmail.com

شمیم حنفی ۱۷ نومبر کو ۷۵ سال کے ہو جائیں گے۔ اس موقع پر میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی انجمن ترقی اردو (ہند) کے جواں سال سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ سے یہ لکھنے کی فرمائش کی اور شمیم حنفی کے علمی و ادبی سفر کے مختلف پڑاؤ کی جانب اشارے کیے۔ ۷۵ سال کی آخری دہائی ذاتی طور پر میرے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس میں انھیں بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ ۱۹۹۱ میں جے این یو میں میرا داخلہ ہوا اور ایک طالب علم کے طور پر انھیں پڑھنا شروع کیا۔ ایم اے کے دوران ان کی بعض تحریریں پڑھ تو گیا مگر ان سے کوئی باقاعدہ رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔ میں نے ان کی پہلی تحریر 'آنچل' میں پڑھی تھی جس کا عنوان تھا 'شبلی کی

ہو جاتے تھے۔ شمیم حنفی کو میں نے جے این یو میں زیادہ تر صدیق الرحمٰن قدوائی، اسلم پرویز اور شارب ردولوی صاحب کے ساتھ آتے جاتے اور گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ زبانی امتحان کے لیے آتے تو وہ موقع بڑی خوشی کا ہوتا تھا۔ ان کو سننا اور دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ ایک عجیب سا جادو ان کی آواز میں تھا۔ اس وقت انھیں سمجھنے سے زیادہ دیکھنا اور سننا اہم تھا۔ طالب علموں سے ہمیشہ انھیں خندہ پیشانی سے ملتے ہوئے دیکھا۔ زبانی امتحان کو بھی انھوں نے اپنے علم سے مشکل نہیں بنایا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ زبانی امتحان ختم ہونے کے بعد اس موضوع سے متعلق کچھ اور بنیادی باتوں اور کتابوں کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے کہ آپ کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے تھی۔ تحقیقی مقالے



شخصیت اس وقت میں بی اے میں تھا۔ مضمون کا ایک جملہ آج بھی یاد ہے کہ اس وقت یہ فکر سب سے زیادہ شبلی کو تھی کہ قوم کہیں بے چہرہ نہ ہو جائے۔ کئی مہینے تو انھیں خاموشی کے ساتھ دیکھتے اور سنتے گزر گئے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ جس شخصیت کو میں اتنی خاموشی کے ساتھ دیکھ اور سن رہا ہوں وہ آنے والے دنوں میں میرے لیے اس قدر اہم

کے معیار کا بنیادی تعلق تو تحقیق کرنے والے سے ہے، اس کی سنجیدگی اور دیانت داری ہی مقالے کو معیاری بنا سکتی ہے۔ نگراں بھی بہت اہم ہوتا ہے لیکن ریسرچ اسکالر نے کہیں اسے ہو بہو نقل کر کے اگر اپنے نام سے مقالے میں پیش کر دیا ہے تو نگراں کہاں تک اس کی نشان دہی کرے گا۔ شمیم حنفی کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کی نظر

سے اس طرح کی چوری اور سینہ زوری مخفی نہیں تھی۔ چناں چہ میں نے انھیں اس جانب بھی اشارہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ شمیم حنفی کو جے این یو کے ہندستانی زبانوں کے مرکز میں آتے جاتے ہوئے دیکھا تھا، وہ آج بھی میری نظر کے سامنے ہے۔ ایک شخص خاموشی کے ساتھ نگاہ نیچی کیے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے، نہ اس کی چال اور رفتار میں کوئی اداکاری ہے اور نہ وہ اپنی رفتار سے بہت جلد فاصلے کو طے کرنا چاہتا ہے۔ ایک بشاش اور روشن چہرے پر بھی فکر کی کوئی لکیر نظر آ جاتی۔ میں آج جب پلٹ کر دیکھتا ہوں کہ جے این یو کے تعلیمی زمانے کی چند نہایت خوب صورت اور بامعنی لمحات وہ ہیں جو شمیم حنفی کو سننے اور پڑھنے میں گزرے ہیں، میں ایک طالب علم کے طور پر یہ

کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے ذہین، حساس اور محنتی طالب علم نے جس قدر شمیم حنفی سے اثر قبول کیا شاید باہر کے کسی اور پروفیسر سے نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جے این یو کا ماحول ترقی پسند فکر سے قریب تھا اور شمیم حنفی اس طرح ترقی پسند نہیں تھے۔ شمیم حنفی کا موسم کے لحاظ سے لباس کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ کبھی لباس اور کپڑے کی طرف سے انھیں بے پروا نہیں دیکھا۔ بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا کہ اتنا خوش لباس آدمی واقعی ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ ایم فل میں میرے مقالے کا موضوع '۱۹۶۰ کے بعد اردو غزل میں تجربات کی نوعیت' تھا۔ پھر کیا تھا شمیم حنفی کی کتاب 'غزل کا نیا منظر نامہ' کا ایک ایک لفظ پڑھ گیا اور اس طرح پڑھا کہ اس کے بہت سے جملے یاد ہو گئے جو آج بھی میرے ذہن میں محفوظ

ہیں جس سے خوشگوار مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے ریسرچ اسکالر سمینار میں اپنا پہلا مقالہ ان کی صدارت میں پڑھا تھا۔ اشرف علی خاں فغاں کا دیوان میں نے مرتب کیا تو اس کی رونمائی کے لیے میری درخواست پر وہ جے این یو تشریف لائے، اس جلسے کی صدارت پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کی تھی۔ وقت گزرتا رہا اور میری پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع صدیق الرحمٰن نے طے کیا تھا اور اس کے مختلف عنوانات کے تعین میں شمیم حنفی کے مشورے شامل تھے۔ شمیم حنفی تو ابتدا ہی سے میرے لیے فکر مند تھے۔ انھوں نے مجھے کلاس روم میں پڑھایا نہیں مگر میری تعمیر و تشکیل میں ان کی فکر مندی پوری طرح شامل رہی ہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی اچھی جگہ میرا تقرر ہو جائے۔ اس خواہش کا

زبانی ہی نہیں بلکہ عملی اظہار بھی انھوں نے کیا۔ جامعہ آنے کے بعد ان سے ملاقاتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا میں اب اس شعبے کا حصہ ہوں جس کی علمی، ادبی روایت کو وقار بخشنے میں شمیم حنفی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اب یہاں پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ جامعہ کے شعبے میں انھیں اسی طرح دھیرے دھیرے نگاہ نیچی کیے ہوئے آتے دیکھا جیسا کہ جے این یو میں دیکھا تھا۔ یہاں بھی گفتگو کا وہی انداز نظر آیا۔ کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس شعبے سے اپنی طویل وابستگی کا کوئی رعب ڈالنا چاہتے ہوں۔ ایک موقعے پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ مجھے جہاں کہیں جس طالب علم میں چمک نظر آئی اسے جامعہ لانے کی کوشش کی۔ بعض موقعوں پر انھیں بالکل اجنبی سا پایا۔ یہ وہی کیفیت ہے جو فکر کی ایک لکیر کے طور پر کبھی کبھی جے این یو میں ان کی پیشانی پر نظر آجاتی۔ انھیں بہت حیرت سے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس حیرت میں بے بسی بھی نظر آئی اور اجنبیت کا احساس بھی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تعلق علمی و ادبی شغف سے ہے۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پڑھنے کے معاملے میں انتخابی ہونا چاہیے۔ انھیں یہ بات اچھی لگی کہ مختلف میلانات کے قلم کار میرے مطالعے کا حصہ ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ انتخابی ہونے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک خاص عمر تک مختلف میلانات و نظریات کی دنیا میں بھٹکنا ایک خوبصورت عمل ہے۔ میں نے نہ صرف اردو کی بلکہ دنیا کے ادب کی چند اچھی کتابیں شمیم حنفی کے مشورے اور تحریک پر پڑھی ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے اوپر مضمون لکھنے یا لکھوانے کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ ایک موقعے پر میرے سامنے رسالے کے مدیر نے ان پر نمبر نکالنے کی گزارش کی تو سختی سے منع کر دیا۔ گزشتہ چند برسوں میں جو ادب کا منظرنامہ میں نے یا آپ نے دیکھا ہے اس میں شمیم حنفی کی شخصیت سب سے مختلف نظر آتی ہے۔ اپنے تعلق سے اتنی بے پروائی اور بے نیازی کسی نقاد کے یہاں نظر نہیں آتی۔ عالم تو یہ ہے کہ لوگ رسالے اور کتاب کا ایک ایک ورق دیکھتے ہیں کہ ان کی تعریف اور تضحیک میں کس نے کیا لکھا ہے۔ شمیم حنفی نے اپنی تحریروں سے جو ایک فاصلہ قائم کیا ہے وہ عصر حاضر کا اہم واقعہ ہے۔ [illegible] نے آصف فرخی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ شمیم حنفی کا علم زیادہ ہے۔ یہاں اس کا حوالہ مجھے اس لیے دینا پڑا کہ بعض اوقات کسی شخص کی فطری خاموشی کو اس کی علمی کمزوری کا نام دے دیا جاتا ہے۔ شمیم حنفی نے اپنی تمام تر علمیت اور ذہانت کے باوجود کبھی چیخ پکار سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے بہت صبر و ضبط کے ساتھ ان لوگوں کو برداشت کیا ہے جو اندر سے خالی اور کھوکھلے ہیں۔ چالاکی اور تعلقات کی بنیاد پر ادب کی دنیا میں جو جگہ بنتی ہے اس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ شمیم حنفی کو جہاں گرجنا اور برسنا چاہیے وہاں بھی ان کا لہجہ دھیما رہتا ہے۔ وہ جب مائک پر آتے ہیں تو مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ مقالوں پر گفتگو کے ساتھ ساتھ وہ خیالات بھی ہم تک پہنچے ہیں جو مقالہ نگاروں کی گرفت میں نہیں آسکے۔ میں ان کی تنقید کی طرف رک کر آؤں گا۔ ذرا اس بات پر غور کرتے ہیں کہ شمیم حنفی کی اس 75 سالہ ادبی زندگی کے کیا معنی ہیں اور کن لوگوں کے لیے بامعنی ہیں۔ شمیم حنفی عمر کی اس منزل پر پہنچ کر کیا سوچتے ہیں، یہ بھی بنیادی سوال ہے۔ یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ دنیا کے کسی بھی ادیب یا قلم کار کے بارے میں سب کی رائے ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ مگر انسان اگر انسان ہے تو ایک کام کر سکتا ہے یعنی سچائی اور حقیقت کا اعتراف۔ کوئی باضمیر شخص اب تک کسی کے بہکاوے یا معمولی لالچ کے لیے کسی کی علمی اور شخصی عظمت کا منکر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شمیم حنفی سے سوال کیا جائے کہ آپ اپنے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوگا کہ دیکھیے کوئی بڑا کام نہیں کیا، لکھتے پڑھتے رہے، کچھ اچھی شخصیتیں اور کچھ اچھی کتابیں رفیق زندگی رہیں اور بس۔ یہ کوئی اداکاری کی باتیں نہیں ہیں، شمیم حنفی نے اپنے معاصر لکھنے والوں پر جتنا لکھا ہے کسی اور نے نہیں لکھا۔ میں یہاں نام گنواؤں اور ان کی تفصیلات میں جاؤں تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔ ان تحریروں سے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شمیم حنفی نے اپنے معاصرین کو کن بنیادوں اور سطحوں پر دریافت کیا۔ آخر وہ کون سا داخلی جبر تھا جس نے انھیں محمود ایاز، باقر مہدی، وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، منموہن تلخ، بلراج مین را، دیویندر ستیارتھی، عابد سہیل، عرفان صدیقی وغیرہ پر لکھوایا۔ گزشتہ نصف صدی کا علمی و ادبی ماحول شمیم حنفی کی کتاب 'دکان شیشہ گراں' اور دیگر تحریروں میں سمٹ آیا ہے۔ میں اسے ایک ادبی اور تہذیبی دستاویز کا نام دیتا ہوں۔ اس میں شعر و ادب کے وہ تمام رنگ روپ موجود ہیں جن سے گزشتہ نصف صدی پہچانی جاتی ہے۔ اس پہچان اور دریافت کا عمل شمیم حنفی کے لیے محض علمی مشغلہ نہیں رہا ہے۔ ان کے لفظوں سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سارا دل لہو کرنے جیسا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اور وہ تمام علمی و ادبی واقعات اور شخصی یادیں ان جانے والوں نے جس جس طرح شمیم حنفی کے حوالے کیا ہے اس معاملے میں وہ تنہا دکھائی دیتے ہیں۔ ان امانتوں کا بوجھ انھیں بعض اوقات حد درجہ گمبھیر اور افسردہ بنا دیتا ہے۔ اس کی وجہ ادبی منظرنامے میں ان امانتوں کی بے حرمتی ہے۔ لیکن میں اسے اس طرح بھی دیکھتا ہوں کہ جب بے حرمتی کرنے والوں کو یہ امانتیں ملی ہی نہیں تو پھر شکایت کیسی۔ شمیم حنفی نے اپنی کئی تحریروں میں اس رنج کا اظہار کیا ہے کہ ادب کی دنیا میں کاروباری ذہن زیادہ پھل پھول رہا ہے۔ صلاحیت اور ذہانت کی قدر افزائی کم ہوتی جا رہی ہے، لیکن کیا کیا جائے کوئی نئی دنیا تو بنائی نہیں جا سکتی اس لیے ہم اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ شمیم حنفی ادبی محفلوں میں شریک ہوں اور ہمیں فکر و احساس کی اس سطح تک لے جائیں جہاں سے اچھے اور خراب ادب کی پہچان ہو سکے۔ شمیم حنفی کے بارے میں چاہے کوئی بھی کچھ کہے لیکن ان کی ترجیحات ہمیشہ علمی و ادبی رہی ہیں۔ انھوں نے باتیں اور ملاقاتیں تو بہت کی ہیں مگر ڈگر برقرار رکھی۔ اس ڈگر سے بہت لوگ شاکی اور پریشان رہے ہیں۔ بات یہاں تک ہو تو بھی ٹھیک ہے لیکن جب اپنی کم علمی اور ذہنی قلاشی کا حساب اس ڈگر سے مانگا جائے تو صورت حال مزید خراب ہو جاتی ہے۔ شمیم حنفی نے بہت موقعوں پر خاموشی اختیار کر لی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس کچھ بولنے کے لیے نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ شمیم حنفی ادب کے کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے جب وسعت نظر کا ثبوت دیتے ہیں تو اس کو دیکھنے اور سننے کا یارا ہم میں نہیں ہے۔ حافظہ بھی بلا کا ہے۔ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ ذہن میں محفوظ ہے۔ زمانی ترتیب میں بھی ان کے یہاں مغالطہ یا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے ایک بات کہی تو پھر آپ کو اس تعلق سے کئی باتیں سننے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے، یہی وہ اختصاص ہے جو بیشتر لوگوں کی پریشانی کا سبب ہے۔ ایک موقعے پر تقریر کرتے ہوئے وہ ہندی کے شعرا کا حوالہ دینے لگے، وہاب اشرفی نے میرے سامنے کہا تھا کہ آپ تو ہندی کے پروفیسر معلوم ہوتے ہیں۔ یوں بھی شمیم حنفی نے ہندی کے تمام اہم ادیبوں اور نقادوں کو توجہ سے پڑھا ہے اور ہندی کے اسکالر کی طرح وہ ان سب پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہندی کے کئی اہم رسالے ان کے یہاں آتے ہیں۔ نرمل ورما تو ان کے بہت پسندیدہ قلم کار ہیں۔ اب ہندی والوں سے آپ شمیم حنفی کے تعلق سے کچھ پوچھیے تو وہ انھیں ہندی کا ادیب نہ سہی مگر وہ اپنا پاٹھک ضرور مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نقاد سے زیادہ قاری کو پسند کرتے ہیں۔ جب وہ کسی سے خوش ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب پڑھتے بہت ہیں۔ تو مجھ جیسے ادب کے ایک طالب علم کے لیے شمیم حنفی اس لیے اہم ہیں کہ ان کی گفتگو سے پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمیم حنفی ایک تخلیقی زبان کے ساتھ دوسری تخلیق کی طرف ہمیں راغب کر رہے ہیں۔ شمیم حنفی کے علم و فن کا دائرہ خالص شعر و ادب یا ہندستانی ادب تک محدود نہیں ہے، وہ اردو کے پہلے ادیب اور نقاد ہیں جنھوں نے بلیک لٹریچر پر مکالمہ قائم کیا۔ یہ شمیم حنفی ہی ہیں جنھوں نے جدیدیت کی فلسفیانہ اساس جیسی کتاب لکھ کر اردو معاشرے کی الجھنوں میں اضافہ کیا اور یہ احساس دلایا کہ بغیر پڑھے ہوئے علم و ادب کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ یہ شمیم حنفی ہی ہیں جن کی کتاب نئی شعری روایت کے ذریعے نئی نظم کے امتیازات سامنے آئے اور جدید اور جدیدیت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مختلف ادوار کی جدیدیت کو اس کے اصل سیاق میں دیکھا۔ شمیم حنفی نے پہلے پہل نئی تنقید ایک اخلاقیات کی ضرورت لکھ کر تنقید کو اس کے اخلاقی منصب کی یاد دلائی۔ شمیم حنفی نے اعمال کی منطق جیسا مشکل مضمون لکھا۔ شمیم حنفی نے یگانہ پر لکھنؤ میں ایک ایسا مضمون لکھا جو اہل لکھنؤ کی پریشانی کا سبب بن گیا۔ مضمون یگانہ کی تخلیقی توانائی اور انفرادیت کے اعتراف میں تھا۔ شمیم حنفی ہی نے ادیب کی ہندوی شاعری کا تجزیہ مختلف انداز میں کیا۔ یہ شمیم حنفی ہی تھے جنھوں نے حسین آزاد کے تاریخی مضمون "نظم کلام موزوں کے باب میں" کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض نئے نکات کی جانب اشارے کیے۔ شمیم حنفی ہی نے بلراج مین را کے فن کو صحیح معنوں میں اردو میں متعارف کرایا۔ قرۃ العین حیدر پر انھوں نے جتنے مضامین قلم بند کیے ان سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا کہ شمیم حنفی قرۃ العین حیدر پر سب سے زیادہ معتبر ہیں۔ یہ باتیں ان کے لیے ہیں جو پڑھنا چاہتے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ تنقید صرف تجزیاتی مطالعے کا نام نہیں ہے۔ تنقید کا کام بصیرت میں اگر اضافہ کرنا ہے تو یہ کام شمیم حنفی کی تنقید اچھی طرح سے انجام دیتی رہی ہے۔ شمیم حنفی نے اپنی تنقید میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس میں کہیں کہیں قصے کا در آنا فطری ہے لیکن یہ قصہ گوئی بے جگہ سے بھی نہیں۔ لوگ پڑھتے کم ہیں اور شور زیادہ مچاتے ہیں قصہ گوئی کا مطلب کیا ہے۔ اسے اگر کوئی گپ کہنا چاہتا ہے تو یہ اس کی اپنی طبیعت کا تقاضا ہے۔ شمیم حنفی کے یہاں چوں کہ ایک کھلی ہوئی فضا ہے اور کسی طرح کا جبر نہیں لہٰذا اس میں ارتکاز بھی پیدا نہیں ہوتا۔ درمیان میں تاریخی، تہذیبی، شخصی حوالے آجاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متن کہیں غائب سا ہو گیا ہے، لیکن غور کیجیے تو متن سے حاصل ہونے والی بصیرت اس میں موجود ہے۔ یہ انداز تو ہمیں محمد حسن عسکری کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس لیے تنقیدی مطالعے میں گفتگو کا انداز اختیار کرنا تنقید کے منصب کو نقصان پہنچاتا ہے تو یہ رائے سب کی نہیں ہو سکتی۔ شمیم حنفی کی تنقیدی زبان کے سلسلے میں جو غیر ذمے دارانہ رائے دی جاتی ہے اس میں ایک سیاست شامل ہے۔ جو لوگ اس طرح فکر انگیز تحریر لکھ نہیں سکتے یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ تنقید کی زبان اسے کہتے ہیں اور اسے نہیں کہتے۔ اس میں شک نہیں کہ شمیم حنفی کی زبان میں ایک چاشنی اور دل آسائی ہے اس پر تخلیقی نثر کا گمان ہوتا ہے لیکن اس میں جو بصیرت ہے وہ

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

مولانا آزاد کے ایک ہم عصر مولانا دریابادی

دوسری قسط

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیتن اپارٹمنٹ، بیلویدرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی-400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

کچھ عرصے بعد جب مولانا آزاد لکھنؤ آئے ہوئے تھے تب مولانا ماجد کے دل میں ان کی کلکتے کی میزبانی کے صلے کا خیال آیا۔ ذہن کے کسی گوشے میں 'حقہ و کرب' کی ہزیمت کی کسک بھی رہی ہوگی۔ انھوں نے مولانا آزاد کی دعوت کی، ساتھ ہی رودولی کے چودھری محمد علی کو بھی بلا لیا۔ اب یہ قصہ ان ہی کے قلم سے سنیے:

''مولانا آزاد اپنی جوانی کے زمانے میں بیسے شوخ و طرار اور (ان کے معتقدین سے معذرت کے ساتھ) فقرے باز تھے، اس کا اندازہ بھی بعد میں دیکھنے والوں کو نہیں ہوسکتا، بات کرنی مشکل تھی۔ ابھی آئے ہیں، ابھی اس پر فقرہ چست کیا، کس کی مجال تھی جو ان سے ٹکر لے سکے۔ 1914 (؟) میں اس خاکسار نے اپنے یہاں 'خاتون منزل' لکھنؤ میں مدعو کیا تو خیال آیا کہ مولانا کے مسلسل وار کون برداشت کرے گا۔ انھیں چودھری رودولوی صاحب کو پکڑ کر بلایا اور بعد آخر تک فقرہ بازی ہی رہی۔''

مولانا ماجد نے 1912 تا 1921 کے دس برسوں کو اپنے الحاد کے دور سے منسوب کیا ہے۔ اسی درمیان 1915 میں ان کی کتاب 'فلسفۂ اجتماع' شائع ہوئی تھی۔ (اس میں کہیں کہیں 'الہلال' اور مولانا آزاد پر چوٹ وار کیے گئے تھے۔ اسیم) اس کتاب کو خلافِ مذہب قرار دے کر حیدرآباد میں شورش پائی گئی تھی اور مولانا ماجد کے خلاف کفر کے فتوے جاری کیے گئے تھے۔ آخر مولانا ماجد نے اس کتاب کو اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کر دیا۔ مولانا آزاد نے ان کے نام لکھے اپنے ایک خط میں اس کا ذکر اپنے دل چسپ انداز میں کیا ہے:

''... یہ تکفیر کا معاملہ بہت ہی دل چسپ رہا۔ مجھ کو امید تھی کہ آپ اس قدر جلد مسلمان ثابت ہو جائیں گے۔ اگرچہ کفر کا مقام اس سے ارفع ہے۔
ع کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو''[12]

چند برس بعد 1918 میں جب مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے، مولانا ماجد نے انھیں خط لکھا تھا اور 'الہلال' کے اصلاحات علمی کے مباحثے میں اپنے نادر ادبی پر نقشت کا اظہار کیا تھا۔ مولانا آزاد نے انھیں جواب تحریر کیا:

''آپ نے لکھا ہے: 'تین چار سال ادھر شاید بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دلوں کی صفائی میں زنگ آگیا تھا۔' آپ نے دل کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، حالاں کہ ہونا چاہیے مفرد۔ میں آپ کو پوری سچائی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میرے حافظے میں کوئی گذشتہ زمانہ ایسا موجود نہیں ہے، جس میں آپ کی جانب سے میرا قلب زنگ آلود رہا ہو۔ الحمد للہ مجھ کو کوئی شکایت نہیں۔ لیکن اگر ہوتی بھی تو انشاء اللہ آپ مجھ کو کبھی شاکی نہ پاتے۔
دامن عشق، بہ توبین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن''

'الہلال' کے اجرا کے بعد ایک صاحب ریاست رئیس قوم نے ایک تین ہندسی رقم (xxx) ماہانہ کے حساب سے ایک سال کے لیے زر تعاون کا چیک مولانا آزاد کو ارسال کیا تھا اور ضرورت پڑنے پر آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا تھا۔ انھیں چیک پھیرتے ہوئے مولانا آزاد نے 'الہلال' میں لکھا تھا کہ ان کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں، وہ اعانت خداوندی پر منحصر ہیں، نہ کہ وسائل قوم کے جود و سخا پر۔ انھوں نے مطلق کی بہت پر تنک کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کوریت آزمیں لکھا تھا:

''... اس بے سروسامانی اور بیمار تعمیر خرابہ کا مقصود جو باادب واجب عرش ہے کہ اس خرابہ وجہاد علائی ہی کو پایۂ تکمیل ہے۔ وہ نور، اور گنج ... کی دولت آج بھی جمع کر چکے، جب بھی وہ جمع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہے۔ یقین کیجیے کہ اس کو تو سوائے شہنشاہ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک بار خرید چکا ہے۔''
(ص 2، 'الہلال' 27 جولائی 1912)

مولانا آزاد کی یہ خودداری آخر عمر تک قائم رہی تھی۔ نظام حیدرآباد کی علم پروری سے سارا ملک فیضیاب ہو رہا تھا، لیکن نظام حیدرآباد کے عہد اقتدار میں مولانا آزاد کبھی حیدرآباد نہ گئے۔ انتہائی نامساعد حالات اور قید فرنگ کے دنوں میں بھی خود نظام کی طرف سے مدد کی پیش کش کو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، اس لیے کہ نظام آزادی ہند کا مخالف اور انگریزوں کا وفادار تھا۔ اس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب مولانا ماجد نے جنوری 1919 میں لکھے اپنے ایک خط میں مولانا آزاد کو یہ اطلاع دی کہ وہ حیدرآباد کی (تین سو روپے مشاہرے کی) ملازمت چھوڑ کر /-Rs.125 روپے ماہوار کے وظیفۂ علمی پر کنارہ کش ہو رہے ہیں تو مولانا آزاد نے انھیں مبارک باد دیتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ آپ نے اچھا کیا کہ حیدرآباد سے کنارہ کش ہوگئے۔ اول تو محض زندگی ملازمت کے ساتھ ناجوبینس تھی، پھر ملازمت بھی دیسی ریاستوں کی اور ریاست بھی حیدرآباد جیسی سازش کدہ!''
(ص 101 'خطوط ابوالکلام آزاد' مرتب: مالک رام)

بہت بعد میں جب 1950 میں حیدرآباد پولس ایکشن کے بعد یہ وظیفہ بھی بند ہو گیا تو مولانا ماجد، مولانا آزاد اور ان کی وزارت تعلیمات سے اپنے وظیفے کی بحالی کے درخواست گزار ہوئے تھے۔ یہ بات مولانا کے اصول کے خلاف تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں نظام کی ریاست کے جاری کردہ وظیفے کی بحالی کے لیے جمہوریہ ہند کو پابند کروانا چاہیے۔ اگرچہ مولانا ماجد کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے کوشش کی، جو بے نتیجہ رہی۔ آخر وہ پنڈت نہرو سے جاکر ملے اور ان کے لیے /-Rs.125 ماہانہ کا وظیفہ جاری کروا لیا۔

فلسفے اور لغویات کی وادیوں میں سرگرداں مولانا ماجد کے دور الحاد میں ان کی بے دینی کی لے اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسلام کے نام سے بھی انھیں شرم آنے لگی تھی اور انھوں نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے فارم میں مذہب کے خانے میں 'ریشنلسٹ' لکھ دیا تھا۔ اکبر الہ آبادی اور علامہ شبلی کی صحبتوں نے انھیں ازسر نو اسلام کی طرف رجوع ہونے کے لیے آمادہ کیا۔ جولائی 1921 میں ان کی اکبر الہ آبادی سے آخری ملاقات ہوئی تھی، تب تک بقول ماجد وہ پورے مسلمان ہوچکے تھے، نماز شروع کردی تھی۔ بزرگوں کے مزاروں پر حاضری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ لکھنؤ، رودولی، دیوہ، بانسہ اور دلی کے پھیرے کیے، اجمیر کے عرس گئے۔ خود اپنے گھر میں ایک عرس قائم کیا۔ محفل سماع میں کثرت سے شریک ہونے لگے تھے، جہاں ان پر اکثر رقت طاری ہو جاتی تھی اور انھیں اپنے وطن کے ایک قوال سے خاص وابستگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں پر بے اختیار کسی کا یہ مصرع یاد آرہا ہے
ع حلاوت نی بھی ظالم نے تو کیا کی!

آگے یہ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ 1929 تک ان بدعات (عرس نوازی، پیر پرستی، قبر پرستی) سے دور ہوسکے تھے، لیکن ان کے آئندہ کے اوراق زندگی میں اس کے شواہد نظر نہیں آتے۔ ان کی تصنیفات اور 'صدق' کی فائلوں میں ان کی سابقہ بدعت کی برقراری کی مثالیں موجود ہیں۔ 1927 میں وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید ہوگئے تھے اور ان کا یہ تعلق (1943 میں) مولانا تھانوی کی رحلت تک گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔ مولانا تھانوی سے ان کے غلو عقیدت کا یہ حال تھا کہ انھوں نے اپنے گلے میں ان کا دیا ہوا تعویذ اپنے کان نانی سے پیدا ہوئی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے ڈال لیا تھا۔ اپنی اہلیہ، حمیرہ اور ربیعہ کی بیماریوں میں بھی وہ اپنے پیر و مرشد کے تعویذ گنڈوں کو مبارک خیال کرتے تھے۔ اپنی کتاب 'حکیم الامت نقوش و تاثرات' میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: ''آج لکھنؤ پھر واپس جا رہا ہوں۔ آج 'بہشتی زیور' میں دیکھ کر اختلاج کا تعویذ اپنے ہاتھ سے نقل کرکے پہن لیا ہے، لیکن جناب والا کے ہاتھ کی برکت ہی یاد آ رہی ہے۔'' 'وفیات ماجدی' میں ایک جگہ حاجی محمد شفیع بجنوری کے فن و ہنر کی ستائش یوں کی ہے کہ انھیں عملیات کا ذوق بھی تھا لیکن فن کے ماہر تھے اور تعویذ، فتیلے اور گنڈے سے گہری شغف رہتے تھے۔[19]

عبدالقوی دسنوی نے مولانا ماجد کے آخر وقت تک کے اہم سفرناموں کا مجموعہ 'سیارہ سفر' کے نام سے مرتب کردیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے، اس دیار کے مزاروں کی زیارت کی کوشش ضرور کی اور ان مزاروں پر ان پر گریہ طاری ہو ہو گیا۔ پھر بھی حال یہ تھا کہ
رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آ گیا

مولانا آزاد نے تو پیری مریدی اور تقلید و جمود ہی کے خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں، جو ان کے لفظوں میں ایک طرح سے سو برس پہلے کے ہندستان میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان کے والد کے معتقد و مرید آزاد کے بھی ہاتھ پیر انھیں مرشدزادہ جان کر چوما کرتے تھے۔ 1904 میں انھوں نے اس وادی ظلمات کو ہمیشہ کے لیے تج کر دیا تھا اور اپنی تحریر و تقریر میں بھی جب جب موقع آیا ایسے توہمات اور فرسودہ روایات پر تازیانے برساتے رہے تھے۔ 'غبار خاطر' میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''انیسویں صدی کے اوائل میں جب دہلی نے نئے دور کا خاتمہ دیکھا تھا تو مرزا ظفر نے حکم دیا تھا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ ادھر روہیلوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، ادھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے 'یا مقلب القلوب' اور 'یا محول الاحوال' کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو اور دوسری طرف ختم خواجگان!''

بہ قول مالک رام انھیں دعاؤں کی افادیت سے انکار نہ تھا، لیکن وہ ہمتوں کا اعادہ کو ترک عمل کا حیلہ بنالینا پسند نہ تھا۔ اسی طرح 'غبار خاطر' میں انھوں نے ایک چڑے کو قلندر، ایک کو ملا اور ایک کو صوفی کا نام دے کر ان کی زبانی سے ملائیت اور مروجہ تصوف پر طنز کے جو تیر چلائے ہیں وہ خاص طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(باقی آئندہ)

اردو دنیا

وزیر اعلا کے دفتر میں اردو یا پنجابی کا ایک بھی میگزین یا اخبار نہیں آتا

نئی دہلی (۱۳ نومبر)۔ وزیر اعلا کے دفتر سے آر ٹی آئی کے ذریعے ملی معلومات سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ دہلی کی وزیر اعلا کے دفتر میں جو ۱۹ اخبارات اور 21 میگزین آتی ہیں ان میں ایک بھی اردو یا پنجابی کا اخبار یا میگزین شامل نہیں ہے جب کہ یہ دونوں دہلی کی دوسرے نمبر کی سرکاری زبانیں ہیں۔ آر ٹی آئی کے جواب میں جو معلومات حاصل ہوئی ہے اس کے مطابق وزیر اعلا کے دفتر میں ۱۹ اخبارات میں صرف ۷ اخبارات ہی ہندی زبان کے ہیں۔ وہیں 21 میگزینوں میں ایک بھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی نہیں ہے، تمام میگزینیں انگریزی کی ہیں۔ ایک سیاسی جماعت کو این ڈی ایم سی سے آر ٹی آئی کے ذریعے معلومات حاصل ہوئی ہے کہ این ڈی ایم سی کے نویگ اسکول ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت دہلی میں چل رہے اسکولوں میں اردو اساتذہ کا ایک بھی عہدہ نہیں دیا گیا ہے۔ یہ حال صرف اردو کا ہی نہیں بلکہ پنجابی زبان کا بھی ہے۔ نویگ ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت دہلی میں 11 سرکاری اسکول چل رہے ہیں، جن میں تین پرائمری، ایک مڈل اور سات سینئر سیکنڈری اسکول ہیں۔ نویگ ایجوکیشنل سوسائٹی کے اسکولوں کے علاوہ این ڈی ایم سی کے 8 سینئر سیکنڈری اسکول، 6 سیکنڈری اسکول، 6 مڈل اسکول، 21 پرائمری اسکول اور 18 نرسری اسکول ہیں۔ ان 150 اسکولوں میں اردو زبان کے لیے 64 اساتذہ (پی جی ٹی اور ٹی جی ٹی دونوں) کے عہدے رکھے گئے ہیں، لیکن 64 اساتذہ میں سے بھی 11 اردو اساتذہ کے عہدے خالی ہیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ان 150 اسکولوں میں صرف دو اساتذہ کو ہی پنجابی زبان پڑھانے کے لیے رکھا گیا ہے۔ شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن سے حاصل معلومات کے مطابق وہاں بھی اردو اور پنجابی اساتذہ کی کوئی اسامی نہیں رکھی گئی ہے۔ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے زون 19 ضلع جنوبی- ویسٹ اے دوست وہار سے آر ٹی آئی کا جواب ملا ہے کہ اس زون میں اردو زبان کے استاد کے لیے کوئی عہدہ نہیں ہے۔ اس زون میں کل 21 سرکاری اسکول ہیں اور تمام اسکولوں میں سنسکرت، میوزک اور یوگا کے لیے ٹیچرس موجود ہیں۔ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے زون 20 کی بھی یہی کہانی ہے۔ کسی بھی اسکول میں اردو کا ایک ٹیچر بھی نہیں ہے۔
(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ادیب سند یافتگان کو بھی مجاز امیدوار تسلیم کیا جائے

معلم اردو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے وفد کی ملائم سنگھ یادو سے ملاقات

لکھنؤ (۱۳ نومبر)۔ ریاست کے پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کے عہدوں پر تقرری کے لیے طویل جدوجہد کے بعد اکھلیش حکومت نے کارروائی شروع کی، لیکن افسوس کہ حکومت کی تمام کوششوں اور وعدوں کے بعد بھی افسران حکومت کے سابقہ حکم ناموں کو نظر انداز بلکہ اپنے طور پر منسوخ کر کے حکومت کو بدنام کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اردو داں طبقے کی بہ طور اردو اساتذہ کی تقرری میں رخنہ اندازی ہو رہی ہے۔ اس ناانصافی کے خلاف معلم اردو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے سابق وزیر اعلا اور سماج وادی پارٹی کے سربراہ ملائم سنگھ یادو سے ملاقات کر کے انھیں اس کو دور کرانے کی درخواست کی۔ وفد نے مسٹر یادو کو بتایا کہ ان کے دور اقتدار میں اردو اساتذہ کی تقرری ہوئی، جس میں جامعہ اردو کے امتحانات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے سند یافتگان کو بھی نوکری کے مواقع فراہم کیے گئے تھے۔ اس برس بھی ایسا ہی کیا جانا تھا لیکن افسران نے اردو کے اہل امیدواروں کو تقرری سے دور رکھنے کی سازش کے تحت جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم کے امتحانات کو تو تسلیم کر لیا لیکن بنیادی اور ہائی اسکول کے مساوی امتحان ادیب کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، حالاں کہ گزشتہ ۱۷ اکتوبر کو وزیر اعلا نے بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ سابقہ طریقہ کار کے مطابق ہی اس برس بھی تقرری کا عمل مکمل کرایا جائے گا لیکن افسوس افسران اس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ حالات تو یہاں تک خراب ہیں کہ اطلاع ہے افسران ادیب سند یافتگان کو ٹی ای ٹی پاس کرنے کی سند بھی نہیں دے رہے ہیں۔ کہیں انھیں کاؤنسلنگ میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ تنظیم کے ریاستی جنرل سکریٹری ایم آئی ہاشم نے بتایا کہ تنظیم کے ضلع صدر حافظ محمد عارف کی قیادت اور محمد ہارون، محمد انیس پر مشتمل وفد کو ملائم سنگھ یادو نے یقین دلایا کہ جلد از جلد اس خامی کو دور کرایا جائے گا اور پہلے ہی کی طرح ادیب کی سند کو بھی تقرری میں تسلیم کرایا جائے گا۔
(راشٹریہ سہارا، دہلی)

پولیس عہدیداروں کے دفاتر اور پولیس اسٹیشنوں کے بورڈوں پر اردو زبان نہیں

حیدرآباد (یکم نومبر)۔ شہر حیدرآباد میں جہاں پولیس عہدیداروں اور پولیس اسٹیشنوں کے بورڈوں پر تلگو، انگریزی کے ساتھ اردو زبان بھی تحریر تھی، لیکن ایک نئی تشہیری مہم کے ذریعے اردو زبان کو ان بورڈوں پر سے صفایا کیا جا رہا ہے۔ سٹی پولیس کے عہدیداروں کے دفاتر اور پولیس اسٹیشنوں کے بورڈ پر اپنی تشہیر کے لیے ٹیلی کام کمپنی یونینار (Uninor) بورڈس کی تنصیب کا کام انجام دے رہی ہے اور جہاں اب تک ایسے بورڈس نصب کیے گئے ہیں، وہاں ڈپٹی کمشنر پولیس، اسسٹنٹ کمشنر پولیس اور پولیس اسٹیشنوں کے بورڈوں پر انگلش میں عہدوں اور ناموں کو درج کیا گیا ہے اور تلگو زبان میں عہدوں کا اور پولیس اسٹیشن کا انگریزی تلفظ کی بجائے خالص تلگو زبان یعنی کاریالیہ وغیرہ لکھا جا رہا ہے۔ اس مہم میں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اردو زبان کا صفایا کیا جا رہا ہے۔ یونینار کی طرف سے پولیس عہدیداروں کے دفاتر (ملک پیٹ اے سی پی) اور پولیس اسٹیشنوں پر جہاں جہاں نئے بورڈ نصب کیے گئے ہیں وہاں کہیں بھی اردو زبان کا اندراج نہیں ہے۔
(سیاست، حیدرآباد)

نند کشور وکرم اور نثار عزیز بٹ
عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ سے سرفراز

نئی دہلی (۷ نومبر)۔ ادبی تنظیم مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے زیر اہتمام دوحہ میں واقع شیرٹن ہوٹل کے السلویٰ ہال میں 17 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقسیم اور عالمی مشاعرہ ۲۰۱۳ منعقد کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ہندستانی سفارت خانے کے سربراہ سنیل جین صاحب کے ہاتھوں اردو زبان و ادب کی گراں قدر اور اعلا خدمات کے اعتراف میں ہندستان سے ممتاز فکشن نگار نند کشور وکرم اور پاکستان کے نامور فکشن نگار نثار عزیز بٹ کو پیش کیا گیا۔ مجلس فروغ اردو ادب کے چیئرمین محمد عتیق نے ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ہندستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پاکستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین افتخار عارف کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام میں نظامت فرائض سید اور سید فہیم الدین نے کی۔ اس تقریب میں ایوارڈ یافتگان کی خدمات پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ایک یادگاری مجلہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ادیب شفیع بخاری نے بھی اظہار خیال کیا۔ 17 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب پروفیسر پیرزادہ قاسم کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد دی اور نند کشور وکرم اور نثار عزیز بٹ کی شخصیتوں کے پوشیدہ گوشوں اور فنی مسائل پر بھرپور حاصل گفتگو کی۔ مجلس فروغ اردو ادب کے آرگنائزر کفایت دہلوی کی اطلاع کے مطابق آخر میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندستان سے گلزار دہلوی، مشتاق صدف، انور جلال پوری، نسیم نکہت اور پاکستان سے پیرزادہ قاسم، امجد اسلام امجد، انعام الحق جاوید، رضی الدین رضی اور سلیم کوثر نے شرکت کی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ علاوہ ازیں سید قمر حیدر قمر (سعودی عرب)، ریاض شاہد (بحرین)، فیاض وردگ (کویت)، نسیم الماس شمی (امریکہ) نے بھی بطور خاص شرکت کی جب کہ دوحہ قطر کی نمائندگی عتیق انظر، عزیز نبیل اور منظر نایاب نے کی۔ مشاعرے کی صدارت گلزار دہلوی نے اور نظامت انور جلال پوری نے کی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو مترجمین کے ساتھ انصاف نہیں ہوا

گورکھپور (۷ نومبر)۔ حکومت کے ماتحت اہل کاروں نے ایک بار پھر اردو مترجمین کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہوئے نیا جی او جاری کر دیا ہے۔ اس جی او میں اردو مترجمین کو پہلا پے بینڈ 2000 روپے، دوسرا پندرہ برس کی سروس کے بعد 2800 روپے اور تیسرا 24 سال کی سروس کے بعد 4200 روپے پے بینڈ دینے کا اعلان کیا گیا، لیکن اردو مترجمین ایسوسی ایشن کے ریاستی سکریٹری عزت حسین کے مطابق اس سے اردو مترجمین کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ انھیں ترقی کے ساتھ ساتھ 4 پرموشن دیا جانا چاہیے اور ان کے مطابق پہلا پرموشن 10 سال کے بعد، دوسرا 16 سال بعد اور تیسرا اے سی پی 26 سال بعد ملنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب اردو مترجمین جونیئر اسسٹنٹ ہی رہ جائیں گے جب کہ پرانے نظام کے مطابق انھیں ایڈمنسٹریٹو افسر بنایا جا سکتا تھا۔ تنظیم کے ضلع سکریٹری محمد اکرم نے بتایا کہ پچھلی حکومت نے ترقیاتی گریڈ لاگو کیا تھا جس کے تحت اردو مترجمین کو ۲۰۰۸ سے ہی 2800 روپے پے بینڈ مل رہا ہے اور 15 سال کی سروس مکمل کرنے کے بعد انھیں 4200 روپے پے بینڈ دیا جا رہا ہے۔ لیکن نئے جی او نے اس میں ترمیم کر دی ہے جس کی وجہ سے اردو مترجمین میں سخت بے چینی ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا ہے کہ مساوی کام کے لیے مساوی تنخواہ، پرموشن اور اردو مترجمین کے عہدوں کی میرٹ کا تعین حکومت واضح طور پر کرے۔ نئے جی او میں ترمیم کے مطالبے پر تنظیم نے تحریکی مہم شروع کی ہے، جس میں حکومت سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اردو والوں کے ساتھ انصاف کرے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو کے دور اقتدار میں ہی اردو مترجمین کی تقرری ہوئی تھی اور سماج وادی پارٹی کے دور اقتدار میں ان کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونی چاہیے۔ دوبارہ میں اردو مترجمین کی تقرری کے عمل میں بھی سپریم کورٹ کے احکام کی پابندی پوری طرح نہیں کی گئی۔ ۲۰۱۰ میں جاری حکم نامے میں سپریم کورٹ نے کہا تھا کہ ۲۰۰۳ میں الہ آباد ہائی کورٹ نے تقرری کے لیے ۱۹۹۶ میں ہی کامیاب امیدواروں کو

سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کا معاملہ

نئی دہلی (۵/نومبر)۔ اردو کی بقا اور مسائل پر آبجیکٹیو مائناریٹیز ویلفیئر فاؤنڈیشن کے چیئرمین فرید احمد کی قیادت میں سرکردہ شخصیات نے دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت سے ملاقات کی۔ وفد میں دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خاں، صنعت کار قیام الدین، عمر دین، عالم بیگ، منصور ضیا، نعیم احمد، سلمان فاروقی، محمد سلمان، محمد ناصر، رحیم میاں، مخدوم ضیا وغیرہ شامل تھے۔ فرید احمد نے وزیر اعلیٰ سے کہا کہ دہلی میں گزشتہ پندرہ برسوں میں حکومت کے ذریعے کرائے گئے تعمیراتی اور فلاحی کاموں کی ہم ستائش کرتے ہیں۔ اس دوران مسلمانوں کے تعلق سے بھی حکومت نے کام کیے مگر ایسے کام جو مسلمانوں کے مستقبل کو سنوارنے، معاشی اور تعلیمی حالات کو بہتر بنانے کے لیے ضروری تھے، وہ ابھی تک معرض التوا میں ہیں۔ مثلاً اردو ٹیچروں کی تقرری تو ہوئی مگر خود حکومت کی جانب سے منظور شدہ 21 اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں ۱۹۹۵ سے حساب، سائنس، سماجی اور دیگر مضامین پڑھانے والے اساتذہ کی بھرتی محض لسانی تعصب کی بنا پر روک دی گئی ہے۔ حکومت کے مختلف اداروں میں نہ ہی اردو افسر تعینات کیے جارہے ہیں اور نہ ہی اردو مترجمین کی تقرری عمل میں آرہی ہے، حالانکہ خود وزیر اعلیٰ نے ان تمام وعدوں کو پورا کرنے کا بہت مرتبہ وعدہ کیا، مگر افسر شاہی اور نوکر شاہی کی اقلیت دشمنی کی وجہ سے یہ مطالبات آج تک پورے نہیں ہوسکے۔ وفد میں شامل تمام ارکان نے وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان تمام معاملات میں کشادہ دلی سے کام لیں اور اردو کے جائز مطالبات کو اپنے منشور میں شامل کریں۔

(انقلاب۔ دہلی)

60 برسوں میں اردو اخبارات کی اشاعت میں زبردست اضافہ

۲۲/اگست کو پارلیمنٹ میں کیے گئے سوال پر مرکزی وزیر منیش تیواری نے رکن پارلیمنٹ چودھری منور سلیم کو جواب بھیجا جس میں کہا گیا کہ ۱۹۵۷ء میں اردو اخبارات کی کل تعداد 513 تھی تو ۲۰۱۳ میں یہ تعداد 5822 ہوگئی ہے

نئی دہلی (۳/نومبر)۔ اردو زبان مررہی ہے، اردو اخبارات ختم ہورہے ہیں، اردو اخبارات بند ہورہے ہیں، اردو اخبارات کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مرکزی حکومت نے صاف کردیا ہے کہ گزشتہ ساٹھ برسوں میں اردو اخبارات کی تعداد میں اس کا اضافہ ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو اخبارات کی اشاعت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ گزشتہ ۲۲/اگست ۲۰۱۳ کو پارلیمنٹ کے جاری اجلاس میں سماج وادی پارٹی کے رکن راجیہ سبھا چودھری منور سلیم نے حکومت ہند سے اردو اخبارات کی خستہ حالی پر سوال اٹھائے تھے اور اس کے لیے حکومت ہند کو ذمہ دار قرار دیا تھا۔ چودھری منور سلیم نے ایوان میں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے اب تک کے تمام اردو اخبارات کی تفصیل مانگی تھی جس کا جواب مذکورہ بالا انداز میں دیا گیا۔

مرکزی وزیر برائے نشر و اشاعت منیش تیواری نے چودھری منور سلیم کو اردو اخبارات کے سلسلے میں اپنا تحریری جواب بھیجا ہے۔ دلچسپ چونکانے والی بات انھوں نے یہ بتائی ہے کہ حکومت کے پاس ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر یکم جولائی ۱۹۵۶ تک اردو اخبارات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کے اخبارات کے رجسٹریشن کا دفتر (آر این آئی) جو اخبارات کے نام کی منظوری اور رجسٹریشن کے لیے ہے، جس کا قیام یکم جولائی ۱۹۵۶ میں عمل میں آیا، لہٰذا اس کے ریکارڈ کے مطابق آزادی سے لے کر اب تک اردو اخبارات کی اشاعت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ منیش تیواری نے بتایا کہ آر این آئی کے ریکارڈوں کے مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۵۷ء کو شائع ہونے والے اردو اخبارات کی کل تعداد 513 تھی جو ۳۱/مارچ ۲۰۱۳ کو کئی گنا بڑھ کر 5822 ہوچکی ہے۔

اردو اخبارات کے سرکاری اشتہارات کے تعلق سے پوچھے گئے سوال پر مرکزی وزیر نے کہا کہ پہلے کے مقابلے اب زیادہ اشتہارات مل رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈی اے وی پی کے پینل میں رجسٹرڈ اردو اخبارات کی کل تعداد سال ۰۳-۲۰۰۲ میں محض 147 تھی جو بڑھ کر ۱۳-۲۰۱۲ میں 569 ہوگئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو اخبارات کو دی گئی رقم سال ۰۳-۲۰۰۲ میں ایک کروڑ 55 لاکھ روپے تھی جو بڑھ کر سال ۱۳-۲۰۱۲ میں 17 کروڑ 33 لاکھ ہوگئی۔ اردو اخبارات کو ادا کی گئی اشتہارات کے ذریعے دی گئی رقم سال ۰۳-۲۰۰۲ میں ساڑھے تین فیصد سے بڑھ کر ۱۳-۲۰۱۲ میں ساڑھے چھ فیصد ہوگئی ہے جو سال ۱۳-۲۰۱۲ کے دوران شائع ہوئے اشتہارات کی فہرست میں ہندی (۳۹ فیصد) اور انگریزی (۲۰.۲۹ فیصد) کے بعد اردو تیسرے مقام پر ہے۔

مرکزی وزیر نے کہا کہ مذکورہ بالا صورت حال اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اردو اخبارات میں اشاعت کی تعداد اور اشتہارات کے ذریعے اردو اخبارات کو دیا گیا کاروبار گزشتہ برسوں کے مقابلے بڑھ رہا ہے۔ اردو اخبارات کی خستہ حالی پر پارلیمنٹ کے اندر سوال کرنے والے چودھری منور سلیم حکومت کے اس جواب سے حیرت زدہ ہیں اور اب وہ یہ سوال کررہے ہیں کہ اگر اردو اخبارات ہزاروں کی تعداد میں ہیں تو پھر مارکیٹ میں دکھائی کیوں نہیں دیتے؟ آخر یہ کون لوگ ہیں جو اشتہارات تو لیتے ہیں لیکن اردو کے اخبارات شائع نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا کہ اگر پانچ ہزار اردو کے اخبارات بازار میں آجائیں تو اس سے اردو زبان بھی مضبوط ہوگی۔

(انقلاب۔ دہلی)

رنگاریڈی کے اردو مدارس میں اسکول اسسٹنٹ کی اسامیاں خالی

حیدرآباد (۳/نومبر)۔ ریکارڈ ٹیچر جناب ایم اے رشید نے کہا کہ اردو کو ریاست کے پندرہ اضلاع میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن عمل آوری نہیں ہے، اس کی زندہ مثال ضلع رنگاریڈی ہے جہاں ضلع پریشد ہائی اسکولوں میں اسکول اسسٹنٹ کی کئی اسامیاں خالی ہیں۔ جب کہ تلگو اور انگلش اسکولوں میں اسکول اسسٹنٹ کی اسامیاں پر کردی گئی ہیں۔ صرف اردو اسسٹنٹ کی خالی پوسٹ کو پر نہیں کیا جارہا ہے۔ تفصیلات کے بموجب ضلع رنگاریڈی میں اکتوبر ۲۰۰۹ میں دو اسکول اسسٹنٹ اسامیوں پر تقرر کیا گیا تھا اس کے بعد سے آج تک یعنی گزشتہ چار سال میں کسی اسکول میں اسکول اسسٹنٹ پوسٹ پر تقرر عمل میں نہیں آیا ہے۔ جن مقامات پر اردو اساتذہ کی پوسٹیں خالی ہیں ان میں حلقہ چیوڑلہ، مرودگر، ابن لی آنجہانی حسین شاہ ولی درگاہ، سوالاتی، شاہ آباد، صنعت نگر، تقرری اور ہون پلی کے علاوہ دوسرے اور بھی ضلع پریشد اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں پوسٹیں خالی ہیں۔ وزیر تعلیم اور ڈائرکٹر ایجوکیشن کے علاوہ اعلیٰ عہدیداروں کو فوری طور پر اپنی توجہ اس اہم مسئلے پر مرکوز کرنی چاہیے۔ ان اسکولوں میں اردو تعلیم و تدریس انجام دینے کے لیے عملی طور پر تقرری کی ضرورت ہے۔ ضلع رنگاریڈی میں اردو تعلیم حاصل کرنے والوں کی کافی تعداد ہے۔ ضلع رنگاریڈی شہر حیدرآباد سے متصل ہونے کی وجہ سے یہاں پر لوگ اپنے بچوں کو تلگو۔ انگلش کے ساتھ ساتھ اردو میڈیم بھی دلوانے کے خواہش مند ہیں، اس لیے حکومت کی جانب سے اردو ٹیچرز، اسکول اسسٹنٹ، ہیڈ ماسٹر جیسے اہم پوسٹوں پر تقررات کی فوری ضرورت ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

تقرری کا اس قرار دیتے ہوئے ان کی تقرری کی ہدایت دی تھی مگر بی ایس پی حکومت نے مختلف بہانوں سے اسے لٹکائے رکھا تھا اور جب ۲۰۱۰ میں حکومت نے نوٹس جاری کیا تو تقرری اتنی دی گئی مگر ۲۰۱۰ سے اس کا نفاذ ہوا اس وجہ سے دیوریا میں تعینات اردو مترجمین اپنے دو مرتبہ بھی عہدوں سے ۱۲ سال پیچھے ہوگئے اور انھیں سینیارٹی سے محروم ہونا پڑا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو اسکولوں میں کنڑا ٹیچر کا تقرر کیا جائے

ہوسکوٹے، کرناٹک (۳/نومبر)۔ سرکاری اور امدادی اردو اسکولوں میں کنڑا اساتذہ کا تقرر وقت کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار سید تنویر پاشا (صدر الامین ریزیڈنشیل اسکول ٹرسٹ) نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے حکومت کرناٹک سے اپیل کی کہ اردو اسکولوں میں کنڑا اساتذہ کا تقرر جلد از جلد کیا جائے۔ جناب انیس قدیر احمد (کونسلر ہوسکوٹے) نے اپنے خطاب میں کنڑا کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہر ریاست کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے، اسی طرح کرناٹک کی کنڑی تہذیب ہے۔ عبدالرحمن (صدر، اسکول ایجوکیشن سوسائٹی) نے شرکائے جلسہ کو کنڑا راجیہ اتسو کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے طلبہ وطالبات کے ثقافتی پروگرام کو سراہا۔

(سالار۔ بنگلور)

ہندی/ اردو میں نیم پلیٹ لگانے کی ہدایت

رودرپور، یوپی (۲/نومبر)۔ ریاستی حکومت کی ہدایت پر سبھی سرکاری دفاتر میں ہندی، اردو کی نیم پلیٹ لگانا لازمی ہے، جس پر ڈائرکٹر جنرل پولیس کے فرمان کے تحت یقینی کیا گیا ہے کہ سبھی سرکاری دفاتر میں نیم پلیٹ ہندی، اردو زبان دونوں میں لگائی جائیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

قاضی صولت حسین کی رحلت پر 'بزم ادب' کی تعزیتی نشست

ناگپور (پریس ریلیز)۔ اردو کے معروف نعت گو شاعر قاضی سید صولت حسین کا ۱۵/اکتوبر ۲۰۱۳ کو حرکت قلب بند ہونے سے ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی رحلت پر ناگپور میں کالج کے اردو عربی اور فارسی اساتذہ کی ادبی انجمن 'بزم ادب' کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ناگپور یونیورسٹی میں اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر اظہر حیات نے فرمائی۔ انھوں نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مرحوم قاضی صولت حسین ناگپور میں سیشن جج کے منصب سے سبکدوش ہوئے تھے۔ مرحوم ملنسار اور منکسر المزاج طبیعت کے مالک تھے۔ صولت صاحب کا تعلق ایک پڑھے لکھے اور ادبی خانوادے سے تھا۔ انھیں ادبی مذاق ورثے میں ملا تھا۔ وہ عشق رسول میں سرشار رہتے تھے اور صرف نعت پاک میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ گزشتہ دنوں مرحوم کے نعتوں کا مجموعہ اوراق مقدس منظر عام پر آیا تھا جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

مرحوم کی اہلیہ محترمہ ثریا صولت حسین بھی معروف ادیب و شاعرہ ہیں۔ تعزیتی نشست میں پروفیسر ریحانہ تبسم، ڈاکٹر انجم آرا، ڈاکٹر اظہر ایاز، ڈاکٹر وحید سوری، پروفیسر نصرت مہدی، ڈاکٹر عمران احمد اور پروفیسر اسرار احمد شریک تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر صبیحہ کوثر نے انجام دیے۔

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مانجھی (ناول)
ناول نگار : غضنفر
ضخامت : ۱۳۹ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razakidak@gmail.com

اردو میں ناول نگاری کے جس سلسلے کو بیسویں صدی میں فروغ ملا زیر تبصرہ ناول 'مانجھی' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ عصر حاضر کے اردو ناول نگاروں میں جو نام سرفہرست ہیں ان میں ایک نام پروفیسر غضنفر کا بھی ہے۔ پروفیسر غضنفر یوں تو درس و تدریس سے وابستہ ہیں لیکن شروع سے ہی فکشن کی راہ پر گامزن رہے یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل ان کے تقریباً آٹھ ناول منظر عام پر آکر داد و تحسین قبول کر چکے ہیں۔ غضنفر کی نثر نگاری میں ہندوستانی رنگ و آہنگ کی آمیزش نظر آتی ہے۔ ان کے ناول میں جو کردار ہوتے ہیں یا جو موضوع اخذ کیا جاتا ہے اس میں مخلوط کلچر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ 'مانجھی' کے حوالے سے بحث کی جائے تو اس میں ہندوستانی تہذیب میں گنگا جمنا کے سنگم کو ہندوستان کے ہندو مسلم تہذیب سے سرشت دی جاتی ہے اور اسی پیرائے میں 'مانجھی' کی کہانی آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ ناول نگار جگہ جگہ اپنی فنی کاریگری سے قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتے ہیں، کہیں کہیں سوالیہ انداز میں اسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور کہیں ذہن کے بھاری پن کو ختم کرنے کے لیے کچھ ایسی لذتیت والی کہانی بھی سناتے ہیں جہاں قاری دم بخود ہو کر ناول میں گم ہو جاتا ہے اور پھر ورق در ورق پڑھتا چلا جاتا ہے لیکن وہ بوجھل پن محسوس نہیں کرتا۔ انداز بیان کی اثر آفرینی، روانی، بے تکلفی، شگفتگی اور سیدھے سادے نثر سے قاری کو محسور کرنے کا فن غضنفر کو بخوبی آتا ہے۔ مانجھی میں الٰہ آباد سے وشوناتھ رائے یعنی وی این رائے کی عمر کی سیر شروع ہوتی ہے۔ سنگم پر بوڑھے ویاس مانجھی کے بیانیہ داستان کے ذریعے آگے بڑھتا ہے جس میں راج کمار کی کہانی بیان کی گئی، ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں وی این رائے سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا ہے جس میں ہندو مت، دان کرنے کی اہمیت ہے، پنڈوں کے لیے دان دان کرنے کا بھی بڑی خوب صورتی سے ذکر کیا گیا ہے لیکن گھسیارے کی ہوشیاری اور عقل مندی کا ذکر راج کمار کے حوالے سے چلتا ہی رہتا ہے۔ کہیں کہیں کہانی کا رخ جنسی لذتیت کی طرف بھی مڑ جاتا ہے اور ناول چٹ پٹا بن جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''لڑکی نے جب یہ یاد دلایا کہ یاد کیجیے اس شام کو جب ایک داسی ایک خیمے کے باہر گھوڑے کے پاس آپ سے ملی تھی اور اس نے آپ سے لگاوٹ کی باتیں کی تھیں۔ آپ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا تھا اور پھر آپ دونوں ایک خالی خیمے میں چلے گئے تھے اور یاد کیجیے اس رات کو جب آپ نے اس کو اپنے پیار کا نشانہ بنایا تھا اور برسوں کے بھوکے شیر کی طرح اسے نوچ کھسوٹ ڈالا تھا۔''

ناری شکتی کے پس منظر میں اس ناول کی کہانی میں کمزور عورت کے مقابلے شکتی شالی عورت کی تمنا کی گئی۔ عورت کے جسم اور معاشرے کی ذہنیت کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''مرد یہ نہیں چاہتا کہ عورت اس کے برابر میں بیٹھے یہ کتنی بڑی وڈمبنا ہے کہ عورت اسے برابر میں لانا تو چاہتا ہے مگر بٹھا نہیں پاتا۔ ایسا وہ کیوں کرتا ہے صاحب اس لیے کہ بیٹھنے میں عورت دکھائی دیتی ہے لیٹنے میں وہ دکھائی نہیں دیتی...''

مختصر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول ہندوستان اور گنگا کے سنگم سے شروع ہوتا ہے بیچ بیچ میں کچھ تخیلی کہانیاں جنم لیتی ہیں بعد میں ناری شکتی کا ذکر ہوتا ہے اور آخر میں ہندو مسلمانوں کی دوستی اور دشمنی کا ذکر تمثیلی انداز میں کرتے ہوئے سنگم اور سرسوتی کا ذکر بھی ہوتا ہے اور ناول وی این رائے اور ویاس مانجھی کے ارد گرد گھومتا ہوا ختم ہو جاتا ہے اور کئی سوال چھوڑ جاتا ہے جو ہمارے معاشرے میں آج بھی موجود ہے۔ امید کہ یہ ناول اردو زبان و ادب کے گرویدہ حضرات کو پسند آئے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

○○○

نام کتاب : اردو اور اڑیا کا افسانوی ادب ترقی پسندی کے تناظر میں
مصنف : ڈاکٹر شیخ مبین اللہ
ضخامت : ۳۵۲ صفحات
قیمت : ۱۶۳ روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸-کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

بہت عرصے بعد بین اللسانی تقابلی تنقید کی مذکورہ بالا کتاب پڑھی کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ کتاب کیا ہے ڈاکٹر شیخ مبین اللہ کے وسیع مطالعہ اور محنت شاقہ کا آئینہ ہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے شیخ مبین اللہ نے اتکل یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور پھر معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۲۰۰۱ میں این سی کالج، جاجپور کے شعبۂ اردو سے بہ حیثیت ریڈر سبکدوش ہوئے۔ زیر نظر کتاب سے پہلے بھی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور متعدد اڑیا افسانوں کے اردو تراجم معتبر رسالوں میں چھپے ہیں۔

ابتدا میں مصنف نے ترقی پسند تحریک کا تعارف، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اس کا ظہور و ارتقا، اغراض و مقاصد، اس پر جدلیاتی اشتراکیت کا اثر، ہندوستان میں اس تحریک کی نشو و نما اور سیاسی و سماجی پس منظر، روسی ادیبوں جیسے بابا گورکی، گوگول، چیخوف وغیرہ کا ہندوستانی ادب پر اثر، اردو میں اس تحریک کا آغاز، تنظیمیں، کانفرنسیں، منشوروں اور اعلان ناموں کا ہونا اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے رجحانات، اڑیا میں تحریک کا آغاز، ستیہ وادی اسکول، سب جگ ساتھی سنسد اور ترقی پسندی کی نمود پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی کلچر اور گاندھیائی طرز زندگی بیشتر ترقی پسند ادیبوں کے سوچ و فکر پر غالب رہی اور یہی وجہ ہے کہ اشتراکی جدلیات اپنی آب و تاب کے ساتھ پھل پھول نہیں پائی۔

دوسرے باب میں مصنف نے ترقی پسندی کے آغاز (۱۹۳۶) سے قبل اردو اور اڑیا افسانوی ادب اور ناول کے ارتقا، ان پر سیاسی نظریات و تحریک آزادی کے اثرات، پریم چند اور فقیر موہن کے اہم ناولوں کا تقابلی مطالعہ، دونوں زبانوں میں پہلے افسانے کی نشان دہی اور پریم چند اور کالندی چرن پانگرہی کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ نقاد نے کسی تعصب کے بغیر ان کے تفوق اور کوتاہیوں پر اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ اگلا باب بھی اسی کا اضافہ ہے جس میں اردو کے نمائندہ ترقی پسند ناول نگاروں جیسے عزیز احمد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی اور قاضی عبدالستار کے اہم ناولوں کا جائزہ لے کر ان کا موازنہ اڑیا کے ترقی پسند ناول نگاروں جیسے گوپی ناتھ مہانتی، رام پرشاد سنگھ اور کانھو چرن مہانتی کے ناولوں سے کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں زبانوں کے فکشن میں فنی و تکنیکی تجربوں مثلاً شعور کی رو، وجودیت وغیرہ اور ان سے وابستہ ناولوں جیسے شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی' اور گوپی ناتھ مہانتی کا 'دانہ پانی'، قرۃ العین کا 'آگ کا دریا' اور کانھو چرن مہانتی کا 'شربری' کا تفصیل سے موازنہ کیا گیا ہے اور مصنف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''ان دونوں ناولوں کو یکجا کر کے اگر صرف دو ابواب کر دیے جائیں جن میں باب اول 'شربری' ہو اور باب دوم 'آگ کا دریا' تو یہ نیا ناول حیات انسانی اور اس کے ارتقا کی مکمل داستان بن جائے گی''۔ اسی طرح ڈاکٹر شیخ مبین اللہ نے اردو کے مشہور ترقی پسند افسانہ نگاروں جیسے احمد علی، اختر حسین رائے پوری، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو (یہاں یہ کہنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ منٹو صرف اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں ترقی پسند رہے اور بعد میں فرائیڈ کے زیر اثر اپنی الگ راہ بنا لی)، عصمت چغتائی، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، حسن آغا، سہیل عظیم آبادی اور اختر انصاری کی نگارشات کا مقابلہ اڑیا کے ترقی پسند افسانہ نگاروں جیسے بھگوتی پانگرہی، منموہن مصرا، منموہن پٹنائک، بید انند راوت، کالندی چرن پانگرہی، اننت پٹنائک، سریندر مہانتی، بیرہانند چند، راج کشور پٹنائک، راج کشور رائے اور موجودہ نسل کے فنکار بہرال، رگھوناتھ داس، پرمانند دولی، گوری پٹنائک، سداشیو داس، پرسن کمار پانتانی، رتناکر، چندا پانی مہانتی، حسین ربی گاندھی، جگدیش مہانتی اور ویدمندر ستھی کی تحریروں سے کیا ہے۔ اس بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''اردو اور اڑیا دونوں کے ترقی پسند افسانوں کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دونوں میں ترقی پسندی کسی منزل کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس کے ذریعہ آدمی انسانیت کی قدر کرنا سیکھتا ہے نیز ترقی پسند افسانہ نگار دنیا بھر کے تمام انسانوں کو ایک ہی خاندان کے افراد سمجھتے ہیں کیونکہ بین الاقوامی بھائی چارہ ترقی پسندی کا شیوہ ہے۔'' ڈاکٹر مبین اللہ نے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ ترقی پسندوں نے کرداروں پر ماحول کے اثر کو بہت ضروری سمجھا اور اسی لیے دیہی منظر نگاری کو اہمیت دی اور ساتھ ہی سماج میں عورت کے رول اور اس کی آزادی کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو اور اڑیا فکشن کے حوالے سے ان دونوں کا موازنہ کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے دونوں زبانوں میں معاصر فکشن (افسانے اور ناول) کا منظر نامہ پیش کیا ہے اور ترقی پسند ادب کے مستقبل پر اپنی بے لوث رائے کا اظہار کیا ہے۔

جیسا کہ میں شروع ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر شیخ مبین اللہ کی یہ تصنیف ان کی کڑی محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے اور اردو اڑیا زبانوں میں ترقی پسندی کے پس منظر اور ارتقا کو سمجھنے کے لیے کارآمد ہے۔ علاوہ ازیں اس کی حیثیت بطور حوالہ جاتی کتاب مسلم ہے اس لیے ہر لائبریری میں اس کا ہونا لازم ہے۔

بقیہ: شمیم حنفی...

صفحہ ۲ سے آگے

کتنے لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ ہم ایک قاری کے طور پر بصیرت ہی کے متلاشی ہیں، چاہے تنقید کی زبان تخلیقی نثر کا نمونہ ہی کیوں نہ ہو۔ خود شمیم حنفی نے اپنے ایک مضمون 'تنقید کی زبان' میں لکھا ہے کہ تنقید کی زبان سائنسی نہیں ہو سکتی، وہ لکھتے ہیں:

"ادب کے انحطاط کو روکنے کا سب سے طاقت ور اور موثر وسیلہ ادب کے قارئین فراہم کرتے ہیں اور نقاد کو بھی اس معاملے میں ایک لحاظ سے برابر کا حصہ دار ہونا چاہیے۔ ایسا ہونا اسی وقت ممکن ہوگا جب ادبی تجربے کی تفہیم اور ادب کے قارئین کی بنیادیں مشترک ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشتراک انسانی سروکاروں کے ادراک کے بغیر ممکن نہیں اور یہ ادراک کبھی بھی محض اور صرف سائنسی نہیں ہو سکتا"۔

اس اقتباس کے آئینے میں ہمارے عہد کے زیادہ تر جوشیلے نقادوں کا چہرہ مسخ شدہ ہوتا ہے۔ اس وقت تو بعض سنجیدہ نقادوں کا حال یہ ہے کہ کتاب کو پڑھے بغیر تبصرہ کر دیتے ہیں اور فلیپ پر اپنی رائے درج کرا دیتے ہیں اور کسی ادیب یا تخلیق کار کی کسی ایک چیز پر قناعت کر لیتے ہیں۔ سیاق اور تناظر کی بات تو ہم کرتے ہیں مگر خود علمی احتیاط سے ہم یک رخا اور سہل پسند ہو جاتے ہیں۔ شمیم حنفی نے دوسری اہم بات اشتراک انسانی اور انسانی سروکاروں کی ہے۔ یہ پورا جملہ دراصل ان کی تنقیدی فکر کا نمائندہ بھی ہے۔ ان ہی سروکاروں کے سبب شمیم حنفی کے یہاں ایک کھلی فضا اور کہیں کہیں گفتگو کا انداز در آیا ہے۔ ان کی شخصی اور ذاتی پسند بھی اکثر اوقات انسانی سروکاروں سے قریب ہو جاتی ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی انسانی سروکاروں سے دور جاتے یا ان کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھا ہے جن کا ادبی سفر انھی سروکاروں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ معلوم نہیں کن مجبوریوں کے تحت وہ شمیم حنفی کے ان سروکاروں کی مخالفت کرنے لگے۔ شمیم حنفی کے یہاں اگر کسی تکرار کا احساس ہوتا ہے تو اس کی وجہ ان ہی انسانی سروکاروں کی تلاش ہے۔ ان سروکاروں سے ذہنی، علمی اور حسی رشتہ استوار کرنے کے لیے شمیم حنفی نے جو جتن کیے ہیں وہ بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے شاعری بھی کی، ڈرامے بھی لکھے، ترجمے بھی کیے اور ان میں صرف ادبی تحریریں ہی نہیں بلکہ دیگر موضوعات بھی شامل ہیں۔ کالم لکھے، نظموں اور کہانیوں کو پڑھنے اور ان سے معنی دریافت کرنے کے معاملے میں شمیم حنفی نے جیسا ذہن پایا ہے اردو والوں میں اس کی مثال کم ملے گی۔ بلراج مین را نے 'شعور' کے لیے شمیم حنفی سے جو کچھ لکھوایا وہ ایک ذہین مدیر کی ذہانت ہی تو ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ شمیم حنفی خالص ادب کے ساتھ علوم و فنون کے مختلف شعبوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ 'شعور' میں شمیم حنفی کی چھوٹی بڑی جتنی تحریریں شائع ہوئیں ان کا ہر لفظ اس عہد کی تخلیقی سرگرمی کی تاریخ بن گیا ہے۔ مین را کو دوسرا شمیم حنفی نہیں مل سکتا تھا۔ اردو میں پہلی بار زوال پرستی کے سوال پر ایک مذاکرہ کے عنوان سے ایک اہم استفسار پیش کیا جس کے شرکا سارتر، ارنسٹ فشر، ایڈورڈ گولڈ اسٹکر، مالان کندیا تھے اور اس کے علاوہ بھی کئی ایسی تحریریں جنھیں شمیم حنفی نے پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا اور مین را کے 'شعور' نے ہم تک پہنچایا۔ اس کا نتیجہ شمیم حنفی کی کتاب 'ذات، شہر اور زندگی' ہے۔ اس میں آدھی سے زیادہ تحریریں دوسروں کی ہیں لیکن ان کی ترتیب و تشکیل میں شمیم حنفی کا تخلیقی ذہن کارفرما ہے اور یہ کام کسی اور سے ممکن ہی نہیں تھا۔ متن کا تجزیاتی مطالعہ کرنے والے 'ذات، شہر اور زندگی' کو اس نظر سے دیکھ نہیں سکتے، یہ نظر انسانی زندگی کو ایک عام انسان کی نظر سے دیکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے جس میں محبت اور ذہانت تو ہے مگر اس میں غرور شامل نہیں۔ شمیم حنفی نے تنقید کی تمام روایات کو پڑھنے اور برتنے کے بعد اپنے لیے جس روایت کا انتخاب کیا وہ وہی ہے جسے ہم تخلیقی روایت کا نام دے سکتے ہیں۔ اصل میں بعض لفظ یا ترکیب کا استعمال مجبوری ہوتی ہے مگر اس کا مطلب غلط نکالا جاتا ہے۔ اب تخلیقی روایت یا تنقید کی زبان میں تخلیقی شان ہی کو دیکھیے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمیم حنفی گویا تنقید کے نام پر ایک اور تخلیقی نمونہ پیش کرتے ہیں گویا تنقید کو بھی تخلیقی فن پارے کی طرح پڑھیے۔ اسی ضمن میں بات تنقید کے منصب تک پہنچتی ہے کہ یہ تنقیدی زبان نہیں اس میں معروضیت نہیں، وضاحت نہیں وغیرہ۔ ان الفاظ کی بڑی اہمیت ہے لیکن رٹے ہوئے الفاظ دہرانے والوں سے خوف آتا ہے اس لیے کہ ایسے لوگوں کا ذہن ایک خاص مرحلے کے بعد رک سا جاتا ہے۔ اور ایک خاص مرحلے پر رک جانے والے سے خوف آتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید کی نصف صدی دراصل بصیرت کا پچاس سالہ سفر ہے۔ اس میں اتنی رنگارنگی اور وسعت ہے کہ شعر و ادب کی کوئی معیار، روایت اور حوالہ شاید ہی چھوٹ گیا ہو۔ ان سب کے درمیان ایک وحدت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مختلف اصناف اور موضوعات کے بنیادی امتیازات پر نگاہ رکھنے کے باوجود شمیم حنفی نے ادب کو ایک وحدت کے طور پر بھی دیکھا ہے۔ اس زاویے کو پیدا کرنے میں انسانی سروکاروں کو بڑا دخل ہے۔ شمیم حنفی کو جب وہاب اشرفی نے اپنی کتاب 'جدیدیت مضمرات اور ممکنات' میں مابعد جدید نقاد بتایا تو لوگوں کو حیرت ہوئی۔ وہاب اشرفی نے ان کی ایک ایسی تحریر کو بنیاد بنا کر مابعد جدید بتایا تھا جس میں اپنی شعری روایت کو ایک سلسلے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اگر ان کی نگاہ میں شمیم حنفی کی کتاب 'تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ' ہوتی تو دلچسپ اور حیران کن نتائج سامنے آتے۔ گزشتہ چند برسوں میں جس ثقافتی مطالعے اور تہذیبی عمل کا بڑا شہرہ ہے شمیم حنفی نے اسے خاموشی کے ساتھ دیکھا اور برتا ہے۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مابعد جدید تنقید کا مطالعہ انھوں نے جن حوالوں سے کیا ہے وہ حوالے دیگر شخصیات کے یہاں بھی مل جاتے ہیں مگر ان سے شمیم حنفی نے کسی اور طرح سے مکالمہ قائم کیا۔ غیر ضروری طور پر وہ نہ اصطلاحوں کو استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی مفکرین کے نام لکھ کر خود کو جدید تر مفکرانہ میں باخبر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں پر اس کے اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے بعض سنجیدہ افراد بھی چمک دمک میں گم ہو جاتے ہیں اور نہ تو کبھی خود کو محاسبے کے عمل سے گزارتے ہیں اور نہ انھیں چمک دمک کے پیچھے اندھیرے کا سراغ ملتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید گزشتہ تین دہائیوں سے جس طرح تاریخی اور تہذیبی عمل کو ادب کی تعمیر و تشکیل میں اہم بتاتی اور ثابت کرتی رہی ہے اس کو اگر ہم دیکھنا نہ چاہیں تو اس کا کیا علاج ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا کر ہم خوش ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شمیم حنفی کی تنقید کی ایک بڑی طاقت اس کی زبان ہے، قاری کو یہ زبان اس لیے اچھی لگتی ہے کہ اس میں تخلیقی شان تو ہے مگر وہ کسی ادبی متن یا ادبی شخصیت سے بڑا بنا کر قاری کو اپنے آپ میں گم نہیں کرتی۔ وہ فکر و احساس کی جس سطح پر ہمیں لے جاتی ہے اسے معروضیت، وضاحت اور قطعیت کے ذریعہ سمجھا نہیں جا سکتا۔ شمیم حنفی کے یہاں ادب کی قرأت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر تحریر کو اعلا ثابت کیا جائے۔ اور ہر کس و ناکس کو بڑا شاعر، بڑا نقاد اور بڑا افسانہ نگار بتایا جائے۔ وہ تحسینی کلمات کے سلسلے میں بہت حساس رہے ہیں اور ہمارا معاشرہ جس طرح اپنی تحسین چاہتا ہے وہ تقاضا شمیم حنفی سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے شمیم حنفی کے یہاں کچھ لوگوں کو منفی سوچ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عصر حاضر میں ادبی مطالعات کے سلسلے میں جتنے بامعنی اور جامع جملے شمیم حنفی نے خلق کیے وہ بہ طور خاص توجہ طلب ہیں۔ ان میں جو ادبی اور تہذیبی بصیرت ہے اس کا رشتہ اگر کوئی محمد حسین آزاد، فراق گورکھپوری اور محمد حسن عسکری سے قائم کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ ہمیں تو دلچسپی اس بات میں ہے کہ شمیم حنفی نے ادبی متون کو فکر و احساس کی کس سطح پر دیکھا ہے اور اس عمل میں قاری کو کس طرح شامل کیا ہے۔ انھوں نے قاری سے مکالمہ کا عنوان اپنی کتاب کے لیے یوں ہی قائم نہیں کیا تھا۔

٭٭٭

بقیہ: راجیندر یادو کا ذکر...

صفحہ ۸ سے آگے

کتاب کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر مجھے بڑے فخر کا احساس ہوا تھا"۔

مقام افسوس ہے کہ راجیندر یادو کی بہت زیادہ تخلیقات ابھی تک اردو کا لباس زیب تن نہیں کر سکی ہیں، انھوں نے خود یہ فرض انجام کیوں نہیں دیا، اس ضمن میں کچھ کہنا مشکل ہے، شاید تکلف اور کم آمیزی حائل رہی۔ دوسری طرف انھوں نے اردو کی بے شمار تخلیقات کو ہندی میں منتقل کروایا اور شائع کر کے محفوظ بھی کر دیا، اس لحاظ سے ان کا یہ قرض اردو کے قلم کاروں کے ذمے واجب الادا ہے، جسے بہرحال بے باق ہونا چاہیے، جلد یا بدیر۔

اردو کے نامور ادیبوں میں راجیندر یادو کے ساتھ سب سے زیادہ احباب اور قربت قاضی عبدالستار صاحب کو تھی، اور انھیں سب سے زیادہ تعاون غالباً مشرف عالم ذوقی کی جانب سے حاصل ہوا۔ اس کے بعد باوجود تمام تر انکسار، یہ ناچیز خود کو اس فہرست میں شامل خیال کرتا ہے، علاوہ ازیں اردو کے مقبول افسانہ نگار طارق چھتاری بھی ان کے زبردست قائل اور مداح ہیں، ویسے وقتاً فوقتاً ضرورتاً اور مصلحتاً ان کے ساتھ وابستہ ہونے والے اور پھر تکمیل طلب کے بعد تعلق قطع کر لینے والے اردو کے دعویدار تو بہت ہوں گے، اب ان میں سے کتنے لوگ ان کی یادگار 'ہنس' کی بقا و ترویج مسلسل کے لیے عملاً کوئی کاوش کریں گے، یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے۔

حق پرستی و حق گوئی راجیندر یادو کی شخصیت کے روشن پہلو تھے، اس کی زندہ مثالیں دو ہیں: اول اردو کی طرف داری اور حمایت، دوئم فرقہ پرستی کی شدید مخالفت — دامے، درمے، قدمے، سخنے۔ دراصل وہ اردو۔ ہندی تنازعے کو سرے سے ناموجود خیال کرتے تھے، ان کا نظریہ تھا کہ یہ صرف ایک مفروضہ ہے کہ اگر اردو کا فروغ ہوگا تو ہندی کو کسی بھی سطح یا نہج پر نقصان پہنچے گا، اس لیے کہ ہندی ملک کی سرکاری زبان ہے، اس کا یہ مقام طے شدہ ہے، اردو اب اس منصب کی دعویدار ہے ہی نہیں۔ اردو تو صرف اپنے وجود، اپنی بقا اور فروغ کا حق طلب کرتی ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں، نہ ہی کسی قسم کی مخاصمت کی گنجائش۔ اردو کے مسئلے پر راجیندر جی سے راقم کی اکثر طویل طویل گفتگو ہوتی تھی، وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ اس شہر کے پروردہ ہیں جسے مرزا غالب اور نظیر اکبرآبادی کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

(باقی آئندہ)

RRR

راجیندر یادو کا ذکر، اردو کے حوالے سے

اک شمع تھی دلیلِ سحر، سو خموش ہے

پہلی قسط

ڈاکٹر مظفر حسین سید (2911، سر سید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

ایک شمع اور گل ہوگئی، ایک اور آواز خاموش ہوگئی۔ ہندی کے موقر ادیب اور اردو کے خاموش حامی راجیندر یادو بھی راہیِ جہانِ دگر ہوئے۔ 'سارا آکاش' کا خالق اپنے آکاش سے جاملا۔ 'سارا آکاش' ان کی وہ تصنیف تھی، جس کی منزلت ہندی ادب کی حدود سے نکل کر ہندستانی ادب کی توقیر بن گئی، اور اس کی شہرت ملک کی سرحدوں سے باہر بھی پہنچی۔ اس کتاب کے لاکھوں نسخے ہاتھوں ہاتھ بکے، نیز جب اس پر فلم بنی تو اس نے ہندستان میں متوازی سنیما کا باب وا کیا۔ ان کی کئی تخلیقات نے مرتبت سے شکل حاصل کی، صفحۂ قرطاس پر بھی، پردۂ سیمیں پر بھی اور پردۂ خورد پر بھی۔

راجیندر یادو، ہندی ہی نہیں بلکہ ہندستانی ادب کے عظیم قلم کار تھے۔ ان کی موت ایک فرد، ایک فن کار اور ایک ادیب کی موت نہیں بلکہ ادب کے ایک عہد، جہاد کی کے ایک دور کا اختتام ہے، ایک باب بند ہوگیا ہے، اگرچہ کئی نئے باب کھلیں گے، مگر اس نقصان کی تلافی نہیں ہوگی، یوں بھی کہ ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب اور ہر صدف اپنی جگہ ماہتاب ہوتا ہے، علم و ادب کی دنیا میں کوئی کسی کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔

ایک غیر معمولی امر یہ ہے کہ راجیندر یادو کی رخصت عدم محض ہندی دنیا کا ہی نقصان نہیں بلکہ جہان اردو کے لیے ایک خسارۂ عظیم کا پیش خیمہ ہے، کیوں کہ وہ اردو کے پرسکوت مگر فعال حامی اور کسی نہ کسی نہج پر اس زبان کے وکیل تھے، راقم مضمون کا یہ دعویٰ بے دلیل اور بے ثبوت نہیں۔ راجیندر یادو کی رحلت کو ابھی بہ مشکل بیس بائیس دن ہوئے ہیں، اس مختصر عرصے میں ان پر اردو میں تو کم لیکن ہندی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ زیادہ تر تحریریں عقیدت میں چور اور یک طرفہ توصیفی نوعیت کی ہیں۔ اس ماتمی ماحول میں یہ امر غیر فطری بھی نہیں، اس لیے کہ کسی معروضی نگارش اور محاکمہ تک حیثیت اختیار کرنے کے لیے زمانی فصل لازم ہے۔ ابھی یہ واردات تازہ ہے، زخم ہرا ہے، اور کسی منصفانہ تنقیدی مضمون کا مرحلہ ابھی دور ہے۔ تاہم ان کی یہ دو شخصیت کا ایک پہلو عام قارئین سے عموماً اور اردو والوں و اردو خواں حضرات سے خصوصاً، ہنوز پوشیدہ ہے۔ راقم الحروف کا بنیادی مقصد اسی زاویے سے اظہار خیال کرنا ہے اور حتی الوسع حسب توفیق غیر جانب داری کے ساتھ۔

راجیندر یادو ہندی کے بڑے ادیب تھے، چوٹی کے مصنف تھے، پریم چند کے بعد ادبی افق پر نمودار ہونے والی افسانہ نگاروں و ناول نگاروں کی کہکشاں کا ایک روشن ستارہ تھے۔ وہ عہد حاضر کے تین بڑے ہندی ادبا — موہن راکیش، کملیشور اور راجیندر یادو — کے مثلث کا ایک روشن نقطہ تھے، ان کے وداع ہوتے ہی آخری ستون بھی گر گیا، ایک دور کا خاتمہ ہوگیا، ہندی نثر کا ایک قد آور قلم کار ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔ تاہم ہندی کا ایک عظیم ادیب ہونے کے باوصف وہ اردو داں تھے، اردو فہم تھے، اردو کے ہمدرد تھے، دوست تھے اور ایک خاموش مگر باعمل حامی تھے۔ اردو کی طرف داری اور اس کے دفاع کی ان کی بے تقصیر مہم عشروں سے جاری تھی اور ان کی آخری سانس تک جاری رہی۔ راقم السطور کی ان کی ذات ممتاز میں دل چسپی کا محرک ان کی شخصیت کا یہی رخ ہے۔

راجیندر یادو ہندی کے اہم ادیب ہونے کے ناتے اس کے شائق و عاشق تھے، مگر اس کے پہلو بہ پہلو انھیں اردو کے فروغ، اس کی بقا اور تحفظ سے ایک گونہ دل چسپی تھی، اور یہ رویہ کمال سنجیدگی کے ساتھ تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی اردو دوستی کا نقارہ نہیں بجایا، نقارہ تو کیا نفیری بھی نہیں بجائی، بس خاموشی سے کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے ادبی ہندی جریدے 'ہنس' میں اردو ادیبوں، شاعروں و دیگر قلم کاروں کی چنندہ نگارشات کو شامل اشاعت کیا اور جس قدر ادب و احترام کے ساتھ یہ عمل انجام دیا، اس کی دوسری مثال ہندی ادب، صحافت تو کیا کسی علاقائی زبان میں بھی نظر نہیں آتی۔ انھوں نے ایک جہادی کوشش کے تحت اردو کے ادیبوں کو تلاش کرکر کے اپنے حلقے میں شامل کیا، ہندستان ہی نہیں پاکستان کے کلاسکی، عصری اور جدید ادب کے بحر ذخار میں غواصی کی اور فن پارے گوہر موتی کر برآمد کیے، پھر انھیں اپنے معیاری ماہنامے کے صفحات پر آویزاں کیا۔ ان کی ادارت میں اشاعت پذیر 'ہنس' کی کئی عشروں کی تاریخ میں ایسی مثالیں اتنی کثیر ہیں کہ کم از کم بر انگشت ان کا شمار ممکن نہیں۔

راجیندر یادو کے ساتھ خاکسار کی شناسائی، ملاقات، دل چسپی اور کسی حد تک قربت کا سبب بھی اردو اور اردو والوں کے ساتھ ان کا رفیقانہ، ہمدردانہ و ہمت افزا سلوک ہی تھا۔ ان سے اولین ادبی تعارف ان کی کہانی 'خوشبو' کے توسط سے ہوا، کوئی چالیس پینتالیس برس قبل، پھر اشتیاق بڑھا تو ان کی دیگر تخلیقات کی تلاش ہوئی اور تعارف وسیع ہوکر ذاتی ملاقات کی شکل اختیار کر گیا۔ راقم کے دور طالب علمی میں اس کی گزارش کو شرف قبولیت بخش کر انھوں نے کئی ادبی محافل کو رونق بخشی اور نوجوانوں کے ایک پورے قافلے کو اپنی دل چسپیوں کی حدود کو علی گڑھ سے دہلی تک وسیع کرنے کی دعوت دی اور ان کی خواہشات کو مہمیز کیا۔ اس تحریک مسلسل کے طفیل ان سے ان گنت ملاقاتیں دہلی یونیورسٹی اور جواہر لعل یونیورسٹی کے ادبی جلسوں میں ہوتی رہیں۔ قابل ذکر ہے کہ تمام تر تو نہیں مگر بیشتر جلسے اردو سے متعلق ہوتے تھے اور ان میں سے اکثر کی صدارت وہی کرتے تھے، نیز، انتہائی شستہ و شائستہ اردو میں خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے تھے۔ ان کے زیر صدارت کئی مرتبہ اس ناچیز کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا تو انھوں نے جذبۂ شفقت و محبت کے تحت بے جا تعریف کر کے شرمندہ کردیا۔ ان کا وصف یہ تھا کہ جب وہ اردو میں تقریر کرتے تو خالصتاً اردو کے ادیب معلوم ہوتے تھے، اس لیے کہ ان کی اردو میں ہندی الفاظ کی آمیزش نہیں ہوتی تھی، اس کے برعکس جب وہ ہندی میں تقریر کرتے تو ان کی ہندی میں اردو کے خوب صورت الفاظ و اشعار جابجا در آتے، جس سے ان کی زبان دل نشیں ہوجاتی تھی۔ ان کا قول تھا کہ اردو کے امتزاج سے ہندی کی تقریر و تحریر دونوں میں روانی و شیرینی آتی ہے، اپنی اس رائے پر انھوں نے کبھی کوئی مفاہمت نہیں کی، اور نہ ہی اس پر کبھی کسی طور پر شرمندہ ہوئے، یہ امر ان کے اخلاص نیت پر دال تھا۔

اردو کے ساتھ ان کی وسیع دل چسپی کو دیکھ کر راقم الحروف نے ایک دن ان سے براہ راست سوال کر ڈالا کہ آپ اردو خوب پڑھتے ہیں، اتنی اچھی اردو بولتے ہیں، پھر آپ اردو کو اپنا تخلیقی ذریعہ اظہار کیوں نہیں بناتے۔ بظاہر اس بے تکے سوال کا جواب انھوں نے کمال سادگی سے دیا اور کہا کہ "یہ محض اتفاق ہے کہ ادبی سفر کی ابتدا ہندی سے ہوئی، ویسے میرے مطالعے کا آغاز اردو زبان و ادب سے ہی ہوا تھا، دراصل اعلا تعلیم ہندی میں ہوئی اور بس ہم فطری طور پر ہندی کے سانچے میں ڈھلتے گئے، لیکن اردو سے دور نہیں ہوئے، آج بھی نہیں ہیں۔ اردو سے نہ کوئی پرہیز ہے نہ گریز اور اجتناب تو خارج از بحث ہے۔" اس کے بعد انھوں نے مسکرا کر کہا کہ "میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں کہ جب میری کوئی کہانی اردو میں جلوہ گر ہوتی ہے تو مجھے بھی مسرت ہوتی ہے۔ جب نیشنل بک ٹرسٹ نے ہندی کہانیوں کا انتخاب اردو میں شائع کیا تو اس میں موہن راکیش اور کملیشور کے ساتھ میری کہانی بھی شامل تھی، آپ یقین کریں کہ اس

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org